۸ر اگست ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۳۰

اس شمارے میں

اداریہ

اردو گھر کیلئے چندے کی مہم

یہ اطلاع تو دی جا چکی ہے کہ اردو گھر کی تعمیر کے لئے دہلی کی ایک مشہور فرم کو ٹھیکہ دیا جا چکا ہے اور تعمیر کا کام شروع ہونے والا ہے۔ اس عرصے میں اس جگہ کی مٹی کا جائزہ لیا گیا جس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہمیں بنیاد چودہ فٹ گہری رکھنی ہوگی۔ ہماری عمارت میں ایک بڑا تہ خانہ ہوگا جس میں کتابوں کا اسٹاک رکھا جائے گا، اس کے اوپر ستون ہوں گے اور ستونوں پر چار منزل کی عمارت قائم ہوگی۔ عمارت پر سات لاکھ روپیہ کے خرچ کا اندازہ ہے لیکن فرنیچر، بجلی اور پانی کے انتظامات پر دو لاکھ سے کم صرف نہ ہوگا۔ اس طرح نو لاکھ روپیہ ہمارے پاس ہونا چاہئے۔ اس وقت تک چار لاکھ کا حکومت کا وعدہ ہے اور ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہمارے پاس عمارت فنڈ میں موجود ہے۔ اس طرح ساڑھے تین لاکھ روپیہ ہمیں سال بھر کے اندر جمع کرنا ہے۔ ٹھیکے دار سے معاہدہ ہوا ہے کہ اکتوبر ۱۹۷۲ء تک عمارت مکمل کر دے۔ اگر ہماری طرف سے رقم کی ادائگی میں تاخیر ہوئی تو انجمن کو اور زیر بار ہونا پڑے گا۔ اس لئے ساڑھے تین لاکھ کی فراہمی کا کام فوری اہمیت رکھتا ہے اور ہمیں اس کے لئے اپنے سارے ذرائع کام میں لانے ہیں۔

ہم بعض قومی اداروں، ریاستی حکومتوں، مخیّر اور صاحب استطاعت حضرات سے علحدہ اپیل بھی کر رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ کچھ نہ کچھ مدد ضرور کریں گے۔ ہمارے تہذیبی اجتماع بمبئی، دہلی اور حیدرآباد کے علاوہ دوسرے بڑے شہروں میں بھی ہوں گے جن کے ذریعہ سے چندہ فراہم کیا جائے گا۔ لیکن ہم نے ریاستی شاخوں اور ادیبوں اور شاعروں اور ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے چندے کی جو اپیل کی تھی اس پر ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں ہوئی۔ صرف آندھرا اور راجستھان کی ریاستی شاخوں نے ہماری اپیل کا جواب دیا ہے اور یہ شاخیں اپنے حلقے میں چندے کی فراہمی کے لئے قدم اٹھا رہی ہیں۔ امید ہے کہ دوسری شاخیں بھی جلد اپنے وسائل کو دیکھ کر ایک رقم کا تعین کر لیں گی اور اس کی فراہمی کے لئے اقدامات کریں گی۔ ادیبوں اور شاعروں سے بھی اس سلسلے میں اپیل کی گئی ہے۔ انھیں بھی اس کار خیر میں حصہ لینا چاہئے۔ سوال بڑی رقم کا نہیں شرکت اور تعاون کا ہے یہ ماننے کو ہم کسی طرح تیار نہیں ہیں کہ یہ حضرات چھوٹی سی رقم بھی اردو گھر کے لئے نہیں نکال سکتے۔ ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو تو خاص طور پر چندے کی مہم میں شرکت کرنی چاہئے۔ اب تک انجمن کے بہت سے ضروری کام

دہلی میں دفتر نہ ہونے کی وجہ سے پورے نہیں ہو سکے۔ دفتر بن جانے سے دہلی میں ہم زیادہ موثر ہو سکتے ہیں اور اردو زبان و ادب کی ترقی کی مہم کو بہتر طور پر چلا سکتے ہیں۔ تین کروڑ سے زیادہ کی اردو بولنے والی آبادی کے شایان شان اردو گھر کی عمارت بنانا ہے اور انجمن کے کاموں کو بڑھانا اور پھیلانا ہے۔ زبان کی حفاظت کے لئے بہت سے منصوبوں پر عمل کرنا ہے اور ادب کی ترقی کے لئے بڑے پیمانے پر کتابوں کی طباعت کا انتظام کرنا ہے۔ سائنس اور سماجی علوم سے متعلق رسالے نکالنے ہیں۔ اردو کے سارے کلاسیکل ادب کو جو اب بازار میں نہیں ملتا، دوبارہ چھاپنا ہے۔ ابتدائی منزل سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی منزل تک کی اچھی اور معیاری کتابیں تیار کرانا ہیں۔ اردو کی معیاری لغات چھاپنا ہیں، اردو کے بہت سے کالج کھولنا ہیں تاکہ ایک یا ایک سے زیادہ اردو یونیورسٹی کے قیام کا خواب بھی پورا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے اردو دوستوں کو سب سے زیادہ مدد کرنی ہوگی۔ انجمن کے تعاون سے یہ پروگرام پورا ہو سکتا ہے۔ حکومت سے امداد تو ہمیں مانگنا چاہئے اور ہم مانگیں گے اور امداد ملے گی بھی، مگر زیادہ رقم تو اردو دوستوں کے چندے کی ہونی چاہئے۔ اردو گھر تو بنے گا، ہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس موقع پر کتنے اردو دوست اس کام میں ہماری مالی امداد کرتے ہیں۔ وسائل مہیا ہو جائیں تو ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی بقا اور ترقی کو کوئی طاقت روک نہ سکے گی۔ رسیدیں قابل لحاظ تعداد میں بھیجی جا چکی ہیں۔ اب دفتر کو براہ راست چندہ بھیجنا چاہئے۔ تمام معطیوں کی فہرستیں حسب دستور ہماری زبان میں مناسب وقفے سے شائع ہوتی رہیں گی۔

انجمن کے ایک دیرینہ کاتب ابوطاہر زیدی کا انتقال

انجمن کے ایک پرانے ماہر فن کاتب جناب ابوطاہر زیدی کا ایک طویل علالت کے بعد ۲ اگست کو اپنے بڑے لڑکے کے یہاں لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم نہ صرف اپنے فن میں ماہر تھے بلکہ صاحب قلم بھی تھے۔ مزید برآں انتہائی لطافت نفس سے بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔

ان کا انجمن سے لگ بھگ بارہ تیرہ سال تعلق رہا۔ انجمن کی مطبوعات اور اردو ادب کی کتابت کا کام انہی کے سپرد تھا جسے وہ بڑی عمدگی سے انجام دیتے تھے۔ تقریباً ایک سال مسلسل بیمار رہنے کے بعد آخرکار راہی ملک بقا ہو گئے۔

انجمن ان کے سانحۂ ارتحال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتی ہے اور ان کے پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی بھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

• ادارہ ہماری زبان

مولانا حبیب الرحمان الصدیقی میرٹھی کا انتقال

مولانا حبیب الرحمان الصدیقی میرٹھی کا یک شنبہ ۲۰ر جولائی سنہ ۱۹۷۱ء امراوتی (برار) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔ اناللہ۔ مرحوم مولانا اسماعیل میرٹھی کے برادر بزرگ مولانا عبدالحکیم جوش میرٹھی کے پوتے تھے۔ ساری عمر درس و تدریس اور مطالعے میں گزاری۔ اردو کی ٹکسالی زبان پر بڑی قدرت رکھتے تھے اور علم عروض پر ان کی نظر وسیع اور اتنی گہری تھی کہ یا بد شاید۔

مرحوم ایک صاحب طرز مکتوب نگار تھے۔ ان کے چند خطوط رسالہ ایشیا کے مکاتیب نمبر میں جو عرصہ ہوا شائع ہوئے تھے۔ حال ہی میں مرحوم کی بہو بیگم ذکا صدیقی نے ان کے کئی سو مکاتیب جمع اور مرتب کئے تھے جو آجکل "[illegible] حبیب" کے عنوان سے زیر طبع ہیں۔ سیدھے سچے بے تکلف اور بیباک مکاتیب کا یہ مجموعہ شائع ہو کر اردو کے مکتوباتی ادب میں اضافے کا باعث ہوگا۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر تقریباً اسی سال تھی۔

• نامہ نگار

اختر انصاری کا مجموعۂ کلام شائع ہوگیا

اردو شعر و ادب کے پرستاروں کے لئے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ جناب اختر انصاری کے دس شعری مجموعوں کا ایک جامع و نمائندہ انتخاب "دیارِ زخم" کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آگیا ہے۔ یہ ضخیم مجموعہ اختر انصاری کی چالیس سال کی شعری تخلیقات کا خلاصہ ہے اور قطعات، غزلیات، رباعیات اور نظموں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ہے۔

• نامہ نگار

عبدالمغنی

اردو رسمِ خط کا مسئلہ

اردو رسمِ خط کا مسئلہ گرچہ تقسیم سے پہلے بھی ابھرا تھا، مگر تقسیم کے بعد یہ پُرخطر ہوگیا۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب کبھی رسمِ خط کے معاملے کو مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اس کے اسباب و وجوہ ہمیشہ سیاسی رہے ہیں، نہ کہ علمی و لسانی اور بجائے خود یہ بات ہی اس مسئلے کی حقیقت واضح کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

تقسیم سے پہلے جب آزاد ہندوستان کی ہونے والی قومی زبان کی بات چلی تو پہلے مرحلے پر یہی موضوع سامنے آیا کہ زبان تو بداہتہً پورے ملک کی برج بھاشا کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جسے ہندی بھی کہا جاتا ہے اور اردو بھی اور اب آسانی یا مصلحت کے طور پر اس کو ہندوستانی ہی کہنا بہتر ہوگا، مگر رسمِ خط کیوں نہیں دیوناگری کر دیا جائے اس لئے کہ ملک کا ایک بڑا طبقہ دیوناگری سے ایک جذباتی وابستگی رکھتا ہے اور روزِ تسلیم کی کارستانیوں کے نتیجے میں یہ طبقہ سالہاسال سے دیوناگری کا استعمال بھی اس زبان کے لئے کر رہا ہے جس کو یہ ہندی کے نام سے پکارتا ہے (اور جو بجائے خود اپنی موجودہ ہیئت میں فورٹ ولیم کا ایک تخلیقی شاہکار ہے)۔ لیکن اردو کے حامیوں نے پوری سختی کے ساتھ اس نامعقول تجویز کو رد کر دیا۔ اس وقت ایک بات یہ بھی تھی کہ اردو بولنے اور لکھنے والوں کے درمیان رسمِ خط کے موضوع پر اجماع کامل تھا اور کوئی چھوٹے سے چھوٹا حلقہ بھی ایسا نہیں تھا جو اس اجماعِ عام کے خلاف آواز اٹھانے کی حمایت کرتا۔

چنانچہ یہ طے ہوگیا کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان اردو اور ہندی دونوں ہی اپنے اپنے مستقل بالذات رسومِ خط کے ساتھ "ہندوستانی" کے نام سے ہوں گی۔

لیکن آزادی کے بعد جمہوریۂ ہند کی دستور ساز اسمبلی نے اس "عبدالحق راجندر پیکٹ" کی دھجیاں فضائے بسیط میں بکھیر دیں جس کے تحت ہندوستانی بخطِ فارسی و دیوناگری کا فارمولا وضع ہوا تھا اور بعد میں کانگریس اور پوری تحریکِ آزادی کی منظور شدہ لسانی پالیسی بن گیا تھا۔ دراصل معاہدے کی یہی یک طرفہ شکست آزاد ہندوستان میں اردو رسمِ خط کے نام نہاد مسئلے کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس لئے کہ رسمِ خط کا مسئلہ درحقیقت الگ سے کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اس پورے لسانی مسئلے کا ایک جزو ہے جو ملکی سیاست کے ناگفتہ بہ انداز نے زبانِ اردو کے لئے پیدا کر رکھا ہے۔ اس تاریخی تجزیۂ حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ جمہوریۂ ہند میں اردو رسمِ خط کے نام سے جو مسئلہ بار بار ابھارا جاتا ہے اس کی جڑیں کہاں ہیں اور اس کے پیچ و خم کیا ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اردو رسمِ خط کے موضوع پر کسی بحث و نظر کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ سیاست کی راہ سے یہ موضوع چھیڑا گیا ہے اور سیاست ہی کی راہ سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ اردو والے اپنے رسمِ خط کو ہی اپنی زبان سمجھتے ہیں اور وہ جیسا کچھ ہے ان کا اپنا لسانی، ادبی اور علمی و تہذیبی سرمایہ ہے جس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت ان کو گوارا نہیں، جس طرح دستورِ ہند کی مندرجہ ہندوستانی زبان سندھی کے بولنے والوں نے پوری حق پسندی کے ساتھ اعلان کرکے تبدیلی چاہنے والوں کا منہ بند کر دیا۔ لیکن چونکہ یہ بحث چل نکلی ہے اور مرعوبیت اور ابن الوقتی کے باعث خود

علقمہ شبلی

غزل

زیست کیا دشتِ وفا ہے یارو؟
ہر قدم کربِ فزا ہے یارو!

آگ احساس کی ہے دل میں لگی
شاعری ایک سزا ہے یارو!

ہر شناسارہِ الفت میں مجھے
اجنبی بن کے ملا ہے یارو!

میں نے آندھی میں جلایا تھا چراغ
بس یہی میری خطا ہے یارو!

سست گامی میری فطرت تو نہیں
زیست خود آبلہ پا ہے یارو!

بارہا ایک تبسم کے لئے
زہر بھی میں نے پیا ہے یارو!

علقمہ شبلی کے جنوں پہ کیوں ہے
اک یہی قبلہ نما ہے یارو!

اردو لکھنے والوں میں ایک چھوٹا سا، خواہ کتنا ہی حقیر، حلقہ پیدا ہوگیا ہے جو اپنے اغراض و مفادات کے تحت رسم خط کی تبدیلی کی مانگ گاہے گاہے لگاتا رہتا ہے' لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر کچھ علمی و فنی گفتگو ایک بار پھر کر لی جائے' تاکہ زمانہ سازی اور خود فروشی کے اس دور میں فتنے کا دائرہ پھیل نہ سکے اور اردو والوں کا اجماع عام علیٰ وجہ البصیرت برقرار رہے۔ یوں اس موضوع پر کئی ایک مخلص اور قابل حضرات بصیرت افروز تبصرے وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں اور خود میں نے کئی سال قبل اردو اور انگریزی میں بار ہا اس موضوع پر گفتگو کی ہے، بلکہ چند ماہ پیشتر بھی اپنے انگریزی مضمون مطبوعہ "ریڈینس" میں ایک تبصرہ کر چکا ہوں۔ بہر حال ایک بار پھر چاہتا ہوں کہ کچھ حقائق لوگوں کے سامنے آجائیں۔

(۱) سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ رسم خط کی حیثیت لباس کی نہیں ہے کہ اس کو اس اور اُس مصلحت کے لئے بدلا جا سکے اور زبان نئے جامے سے مزین ہو کر درخشاں و تاباں نظر آنے لگے' بلکہ رسم خط زبان کی کھال ہے جو جسم زبان کے ساتھ ہی ساتھ پرورش پاتی ہے' چنانچہ جسم اسی وقت تک زندہ رہ سکتا ہے جب تک کھال سلامت رہے' ورنہ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کھال کھینچ جانے کے بعد بھی کوئی جسم' تھوڑی دیر بعد زندہ رہ سکتا ہے؟ جب ایک زبان کی تشکیل ہوتی ہے اور وہ محض ایک بولی کے مرحلے میں ہوتی ہے' اس وقت تو یہ ممکن ہے کہ آپ جس قالب میں چاہیں اس زبان کو ڈھالیں اور جو رسم خط اس کا چاہیں بنا دیں' مگر تشکیلی مرحلہ گذر جانے کے بعد جب ایک زبان ایک باضابطہ و پختہ رسم خط کے ساتھ پھلنے پھولنے عمل آجاتی ہے اور پھر اس کا ایک ادب بھی علوم و فنون کے خزانے لے کر سامنے آجاتا ہے تو یہاں پہنچ کر رسم خط کی تبدیلی کی بات کرنا بالکل دیسا ہی ہے جیسے ایک جوان آدمی کی کھال ادھیڑ دینے کی بات کی جائے۔ چمڑی کسی کی گوری ہو یا کالی یہ اس کی فطری چمڑی ہے اور اس کا حسن اسی چمڑی میں نکھرتا ہے' ورنہ رنگ کا امتیاز کر کے گوری اکثریت کا یہ مطالبہ کہ پلاسٹک سرجری کر کے کالوں کا رنگ بدل دیا جائے یا کالوں میں سے کچھ لوگوں کی اس درجہ مرعوبیت کہ گوروں کو خوش کرنے کے لئے اپنی چمڑی تک ادھڑوانے کے لئے آمادہ ہو جائیں' ظاہر ہے کہ ایک بے حد نامعقول' غیر فطری اور غیر انسانی حرکت ہے اور جرم قتل سے کم سنگین نہیں۔

(۲) رسم خط چونکہ کھال کی طرح زبان کے ساتھ پروان چڑھتا ہے لہٰذا وہ زبان کی روایت اور تاریخ کا مظہر اور ضامن ہوتا ہے اور ایک کے بعد دوسری نسل تک ذہنی کی زندگی کے تسلسل کا ذمے دار ہوتا ہے' چنانچہ ایک زبان کا رسم خط بدل دینے سے اس کے برا عقد وہی حادثہ رونما ہو جائے گا جو پوری انسانی تہذیب کے ساتھ رونما ہو سکتا ہے' اگر تاریخ عالم اور تہذیبی روایات کو تباہ کر دیا جائے' یعنی اس زبان کی تہذیبی قدریں اور ادبی روایتیں ہی ختم ہو کر رہ جائیں گی اور صدیوں کی ترقی پائی ہوئی ہیئت زبان مدتوں پیچھے لوٹ کر اپنی ابتدائی اور خام تشکیلی ہیئت میں جا پڑے گی اور اس کے ارتقا کی صرف ایک کڑی نہیں بلکہ تمام ہی کڑیاں گم ہو جائیں گی' زبان کا ادب عالی اس کی نئی نسلوں کے لئے ایک اجنبی چیز بن جائے گا' ادب میں روایت کا تخلیقی عمل بند ہو جائے گا' ایک لسانی ثقافت کا ماضی اور حافظہ ہی فنا ہو جائے گا اور اس سب کے نتیجے میں زبان و ادب کے اندر نئی ترجیحات یا تو یکسر رُک جائیں گی یا بے معنی و بے رنگ ہو کر رہ جائیں گی اور ہر حال میں ارتقا کی جگہ انحراف رونما ہوگا۔

(۳) اس صورت حال کی شہادت دنیا کی دو قابل ذکر زبانوں

بشیر بدر

غزل

زمیں سے آنچ، زمیں توڑ کر نکلتی ہے
عجیب تشنگی ان بادلوں سے برسی ہے

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے
تمام جسم کے کپڑے اتار لیتی ہے

ہمارے عہد میں نایاب ہے بچا کے رکھو
تمہاری آنکھ میں اک چیز جو چھلکتی ہے

سروں پہ دھوپ کی گٹھری اٹھائے پھرتے ہیں
دلوں میں جن کے بڑی سرد رات ہوتی ہے

کھڑے کھڑے میں سفر کر رہا ہوں برسوں سے
زمین پاؤں کے نیچے کہاں ٹھہرتی ہے

ہوا، ہمارے ہی سینے میں آکے جلتی ہے
بلند چاند ستارے، زمین گہری ہے

بکھر رہی ہے مری رات اس کے شانوں پر
کسی کی صبح مرے بازوؤں میں سوتی ہے

پگھل رہی ہیں چٹانیں نحیف بانہوں میں
بدن میں پیار کی کیسی عجیب گرمی ہے

ہوا کے آنکھ نہیں، ہاتھ اور پاؤں نہیں
اسی لئے وہ سبھی راستوں پہ چلتی ہے

ترکی اور چینی، میں ملتی ہے۔ وہاں انقلاب کی شورشوں میں اور بالکل سیاسی محرکات کے تحت سرکاری طور پر اصل رسم خط کو بدل کر لاطینی کر دیا گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروباری دفاتر میں تو حکومت کے جبر سے جو کچھ بھی ہوا ہو، مگر ادبی اور ثقافتی دائرے میں زبان کا ارتقا اور تخلیقی عمل رک سا گیا، عوام کے درمیان بھی اس غیر فطری تبدیلی کو پسند نہیں کیا گیا، چنانچہ اس نام نہاد انقلاب کے بعد قدیم اول کے ادبا و شعرا کی کوئی صف ان زبانوں میں نہیں بن سکی۔ معلوم ہوا ہے کہ اب دونوں جگہ اس نامعقول تبدیلی کو ختم کر کے اصل رسم خط کو بحال کرنے کا مطالبہ ہونے لگا ہے اور لوگوں نے اپنے طور پر اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔

(۴) اب سوال یہ ہے کہ اردو رسم خط میں آخر وہ کونسی ایسی خرابی ہے جس کو دور کرنے کے لئے عملی و ذہنی طور پر رسم خط کی تبدیلی ناگزیر ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال تو یہی اٹھتا ہے کہ اگر واقعی لسانیاتی اعتبار سے اردو رسم خط ناقص محض اور یکسر بے کار ہے تو پھر اتنی صدیوں تک اس رسم خط میں تخلیقی عمل اور ادبی ارتقا کس طرح ہوتا رہا؟ رہی یہ بات کہ دورِ حاضر کے صنعتی و کاروباری تقاضوں نے اردو رسم خط کو پس ماندہ و فرسودہ ثابت کر دیا ہے، لہذا کم از کم کاروبار کے لئے رسم خط کو بدل دیا جائے، تو ایک تو یہ کہ رسم خط کی یہ تقسیم و تثنیہ بجائے خود ایک لغو تجویز ہے اور تجربہ بدوز گار ہے، دوسرے یہ کہ اگر محض دورِ حاضر کی رعایت ہے تو پھر محض زبان اور رسم خط ہی پر کیوں بس ہو، اس پرانے آدمی ہی کو کیوں نہ سراپا بدل کر رکھ دیا جائے جو نت نئی مشینوں سے مقابلہ کرنے میں یکسر قاصر نظر آ رہا ہے؟ اور اس بات کی بھی کوئی تک ہے کہ ایک رسم خط علم و فن میں تو کارآمد ہو مگر کاروبار کے لئے ناکارہ ثابت ہو جائے۔

اس لئے لائق اعتنا صرف یہ سوال ہے کہ خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو رسم خط میں نقص کیا ہے؟ جواباً سب سے بنیادی نکتہ یہ عرض ہے کہ دنیا کا کوئی بھی رسم خط ایسا نہیں جو بالکل بے نقص اور سراسر کامل ہو۔ مثال کے طور پر لاطینی ہی رسم خط کو لیجئے، جس کا حوالہ دے کر اردو والوں کو مرعوب کیا جاتا ہے اور اس رسم خط میں لکھی جانے والی دنیا کی اس سب سے ترقی یافتہ زبان کو لیجئے جس کے ذریعے ہی اردو والے عام طور پر لاطینی رسم خط سے واقف ہیں۔ انگریزی زبان کے دورِ حاضر میں سب سے بڑے ادیب برنارڈ شا نے اس زبان کے حروف تہجی کو بے حد ناقص قرار دیا، یہاں تک کہ اس نے باضابطہ اعلان کر کے لوگوں کو دعوت دی کہ جو شخص انگریزی رسم خط کے نقائص دور کرنے کا کوئی کامیاب طریقہ ایجاد کر دے گا اسے ایک کثیر رقم انعام میں دی جائے گی لیکن کوئی بھی یہ انعام نہیں جیت سکا اور یہ ثابت ہو گیا کہ انگریزی رسم خط ناقابلِ اصلاح ہے۔ بہر حال، شا کو اصلاحِ احوال کی فکر یہاں تک دامن گیر ہوئی کہ اس نے اسی موضوع پر اپنا ایک اہم ڈراما لکھا، "پگ میلین"، جس کی فلم بے حد مقبول ہوئی۔

معلوم یہ ہوا کہ دنیا کی کوئی زبان رسم خط کے معاملے میں نقائص سے بالکل پاک نہیں ہے۔ لہذا اردو زبان بھی السنۂ عالم کے اس نقصِ عام میں اگر معمول کا اپنا ایک خاص حصہ رکھتی ہے تو اس میں تعجب اور تشویش کی کوئی بات نہیں۔ اس نظری تحدید کے بعد اردو رسم خط کے حروفِ تہجی پر غور کیا جائے تو حسبِ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(ل) اردو کا رسم خط نہ عربی ہے، نہ فارسی، جیسا کہ عام طور پر بولا جاتا ہے، بلکہ یہ صرف اردو ہے اور یہ دوسری بات ہے کہ اس رسم خط کا تعلق خوش قسمتی سے زبانوں کے اس خاندان کے ساتھ ہے جس کا ہر فرد داہنے ہاتھ سے کام کرنے کے ساتھ داہنی طرف سے شروع بھی کرتا ہے۔ رسم خط حروفِ تہجی کے اس مجموعے کا نام ہے جو ایک خاص انداز سے تحریر کیا جاتا ہے اور زبانِ اردو کے حروفِ تہجی میں صرف عربی و فارسی ہی کی آوازیں نہیں ہیں، بلکہ سنسکرت اور ابتدا کی ہندوستانی بھاشاؤں کی آوازیں بھی شامل ہیں۔

(ب) اردو رسم خط کی اس انفرادیت کی بنا ایک بہت ہی مرکب اور پیچیدہ لسانی تماش پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ مہذب دنیا کے انسانی معاشرے میں جتنی بھی منفرد آوازیں پائی جاتی ہیں اردو حروفِ تہجی میں ان سب کے نقوش موجود ہیں، جب کہ اتنے جامع اور نمائندہ حروفِ تہجی دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں پائے جاتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عالمی سطح پر لسانی اعتبار سے ترقی یافتہ زبانوں میں اردو تازہ ترین ہے، لہذا اس کو اس بات کا موقع ملا کہ اپنی پیش رو زبانوں کی تمام آوازوں کو اپنے اندر سمیٹ اور سمو لے۔

(ج) اس لئے واقعہ یہ ہے کہ اردو کا رسم خط اردو رسم خط ہے، نہ کہ عربی یا فارسی اور اس کے حروفِ تہجی کا صوتی نظام خالص صوتیات کے نقطۂ نظر سے نہ صرف منفرد بلکہ جامع ترین ہے۔ چنانچہ لسانیات کے سب سے اساسی شعبے، صوتیات کے نقطۂ نظر سے اردو کو دوسری زبانوں سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ دوسری زبانوں کو اردو ہی سے کچھ سیکھنا چاہئے۔

(د) اسی طرح اردو حروفِ تہجی کی شکلوں کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عربی اور پھر فارسی تحریر کی شکل سے بنیادی اور

عمومی طور پر متاثر ہونے کے سبب اردو کے اندر تحریری نفاست کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو داہنی طرف سے لکھی جانے والی زبانوں کے خاندان میں پائی جاتی ہیں۔ اس معاملے میں عربی و فارسی ہی کی طرح اردو طرزِ تحریر کے فنی و جمالیاتی پہلو کی خصوصیات لائق توجہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خطاطی و کیلی گرافی، کا فن اردو میں جتنا ترقی یافتہ ہے اتنا ان زبانوں میں نہیں ہے جو بائیں طرف سے لکھی جاتی ہیں۔ فن و جمال کے لحاظ سے ایک قابل غور نکتہ یہ بھی ہے کہ اس معاملے میں اردو کے اندر اعتدال اور توازن ہے یعنی نہ تو جمالیاتی فنکاری اس انتہا تک پہنچی ہوئی ہے کہ حروف محض تصویری علامتیں بن کر رہ جائیں اور اپنی قوتِ اظہار کھو دیں اور نہ تجارتی انداز اس حد پر ہے کہ حروف کی تحریر میں حسن و جمال کی گنجائش ہی کم سے کم ہو۔ اردو حروف کی شکلوں میں فنکاری اور افادیت کا امتزاج ہے، اس میں ایک طرف تو ہمارے خوش نویس خطاطی کے ایک سے ایک دیدہ زیب گل کھلاتے ہیں اور دوسری طرف یہ اتنا گٹھا ہوا طرزِ تحریر ہے کہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ الفاظ لکھے جا سکتے ہیں اور اس نسبت سے وقت بھی کم لگتا ہے۔ آپ اردو رسم خط کو لانگ ہینڈ اور شارٹ ہینڈ دونوں میں بہ آسانی اور بہ خوبی استعمال کر سکتے ہیں۔

(۵) مندرجہ بالا نکات سے واضح ہوتا ہے کہ ہر دوسرے رسم خط کی طرح اردو رسم خط کی کچھ خاص اور منفرد خوبیاں ایسی ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا ٹھیک جس طرح اس رسم خط کی کچھ حدود دوسرے رسوم خط کے مانند ہی ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لسانیاتی اعتبار سے اردو رسم خط کے اندر بائیں طرف سے لکھے جانے والے رسوم خط کے بالمقابل خوبیاں زیادہ ہیں۔

تب سوال یہ ہے کہ آخر رسم خط کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوتا ہی کیوں ہے اور یہ کہ کون سا وہ رسم خط ہے جس کو اختیار کرنا موجودہ رسم خط سے زیادہ مناسب و مفید ہوگا؟ پہلے سوال کے جواب کی طرف اشارہ میں شروع ہی میں کر چکا ہوں یعنی یہ کہ تبدیلی کا مطالبہ سیاسی اغراض کے تحت کیا جاتا ہے اس اشارے کی ایک تفصیل یہ ہے کہ اردو رسم خط چھوڑ دینے سے اردو زبان اقلیت کے تنگ نالے سے نکل کر قومی دھارے کی وسعتوں میں آ جائے گی یا بین الاقوامی سمندروں میں غوطہ زن ہو سکے گی۔ اس معاملے میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا واقعی جمہوریۂ ہند میں اقلیت اور اس کی زبان کا کوئی مستقبل نہیں رہ گیا ہے اور کیا اقلیت اقلیت رہتے ہوئے قوم کا جز نہیں بن سکتی؟ پھر یہ کہ یہ قومی دھارا ہے کیا، کون وہ زبان ہے جس کی روانیوں کو ہم قومی دھارا تصور کریں؟ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے وہ ہرگز نہ تو اکثریت کی زبان ہے اور نہ اسے قومی مرتبہ قبولیت حاصل ہے، شمالی ہند کے سوا ملک کے تمام خطوں نے ہندی کو نہ صرف رد کر دیا ہے بلکہ اس کی کھلی مخالفت کر رہے ہیں اور شمالی ہند میں بھی ہندی کسی بھی بستی کے عوامی اداروں میں بولی اور لکھی نہیں جاتی ہے، بلکہ مختلف علاقوں میں مختلف مقامی بولیوں کا چلن ہے۔ دوسرے سوال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اردو کا رسم خط بدل کر دیوناگری یا لاطینی کر دیا جائے۔ لاطینی کی حقیقت انگریزی کے واسطے سے میں بتا چکا ہوں، جہاں تک لسانی صلاحیت کا تعلق ہے، رہی یہ بات کہ لاطینی کے ذریعے ہم عالمی بازار تک اپنا مال لے جا سکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ اردو رسم خط کے ذریعے بھی تو ہم ایشیا و افریقہ کے ممالک و اقوام سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں اور تبدیلی کا مطلب تو یہی ہو گا کہ اگر ایک براعظم (یورپ) ہاتھ آیا تو دو براعظم ہاتھ سے نکل جائیں گے اور آبادی کے لحاظ سے تو اور بھی زیادہ خسارہ ہوگا؟ دیوناگری کا معاملہ یہ ہے کہ بلاشبہ یہ اردو سے کمتر درجے کا رسم خط ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک عمدہ چیز کو چھوڑ کر ایک بدتر بدل لیں۔

ان تمام وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو رسم خط کو چھوڑنے کا فائدہ ایک بھی نہیں اور نقصانات بے شمار ہیں۔ اس لئے اردو رسم خط کا کوئی مسئلہ در حقیقت نہیں پایا جاتا ہے، یہ بس ایک مصنوعی اور جعلی موضوع ہے جسے ارباب اقتدار کے اشارے پر یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کچھ مرعوب ذہنیتوں نے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

آخری بات یہ کہ اردو رسم خط کو برقرار رکھتے ہوئے بھی بہر حال جدید تمدن اور نئی ضرورتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی و جہد کرنی ہے، مثال کے طور پر ٹائپ اور طباعت کے معاملے میں اردو رسم خط کو زیادہ سے زیادہ کار آمد اور وسیع الاثر بنانا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمارے اصحاب وسائل اور ہنرمندوں کو بلیغ کوشش کرنی ہے اور پیہم تجربے کر کے اپنے رسم خط کی تمام نفاستوں کو جدید آلات کے اندر ڈھال دینا ہے تاکہ مشینی مسابقت میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں اور بڑھتے ہوئے کاروبار تمدن میں بھی ہماری جگہ محفوظ رہے۔ اس سلسلے میں ہمارا نقطۂ نظر کسی انقلاب کا نہیں بلکہ توسیع کا ہونا چاہئے۔ اگر ہماری نظر وسیع اور گہری ہو تو ہم اس معاملے میں انگریزی سے ایک سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ انگریزی رسم خط کے نقائص کے باوجود اس زبان کے مجتہدین فن نے کبھی بھی اس کو بدلنے کی بات نہیں کی، بلکہ وہ مشینوں ہی پر تجربے کر کر کے کلوں اور پرزوں کو بدلتے رہے، تراشتے اور خراشتے رہے، یہاں تک کہ انھوں نے ٹائپ اور طباعت کی وہ جدید سہولتیں بہم پہنچا لیں جن پر آج ہم رشک کر رہے ہیں اور آج بھی انگریزی رسم خط کے بنیادی نقائص اپنی جگہ ہیں اور ان کے باوجود یہ زبان

مراسلات

دیوانِ اسد کے مقطعے

"ہماری زبان" مورخہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۰ء اور یکم نومبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہونے والے دو مراسلوں کے ذریعے میں نے غالب سے منسوب نو دریافت قلمی دیوان (جس کو میں "دیوان اسد" سے موسوم کرنے کو ترجیح دیتا ہوں) کی دو اہم خصوصیتوں کی جانب توجہ دلائی تھی۔ اول الذکر مراسلے میں میں نے اس قلمی دیوان کے ساتھ ساتھ نو دریافت قلمی نقل رضا میں محذوف سنہ کتابت کے بارے میں محققین کو دعوت فکر دی تھی۔ میرے لئے یہ طمانیت کا باعث ہے کہ جناب آل احمد سرور صاحب نے بھی ۲۲ر فروری ۱۹۷۱ء کے "ہماری زبان" میں "پیش لفظ" کے تحت تحریر کرتے ہوئے ان قلمی نسخوں میں سنہ کتابت کی غیر موجودگی کو "پر اسرار" قرار دیا ہے اور "اندیشہ ہائے دور دراز" پیدا کرنے کا سبب بتایا ہے۔

موخر الذکر مراسلے میں میں نے دیوان اسد کے ان مقطعوں کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا تھا جن میں تخلص کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے جب کہ بعض اوقات اسی صفحے پر موجود دوسری غزلوں کے مقطعوں میں اسد تخلص مندرج ہے۔ اس سلسلے میں استاذی ڈاکٹر گیان چند نے "کتاب" (لکھنؤ) مئی، اپریل ۱۹۷۱ء میں "دیوان غالب کے خود نوشت مخطوطے کی بحث" کے زیر عنوان تحریر کرتے ہوئے میرے شکوک کو الزام تراشی سے تعبیر کیا ہے۔ میرے شکوک کی سمت غلط ہو سکتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اس دیوان میں اس اہم کمی کے بارے میں ناقدین نے کوئی تشفی بخش توجیہہ پیش نہیں کی ہے اور میرے شکوک کا ازالہ نہیں ہو سکا ہے۔

کیونکہ یہ موضوع مفید نتائج کی جانب نشاندہی کر سکتا ہے اس لئے اس کی کچھ اور تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ دیوان میں شامل ۲۵۳ غزلوں میں سے ۵۵ میں تخلص کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ تین اور مقطعوں میں اولاً تخلص درج نہ تھا، بعد میں بطور اصلاح شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح بلا تخلص مقطعوں کی کل تعداد ۵۸ ہوتی ہے۔ ردیف وار تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "د" "ہ" اور "ی" کی ردیف کی کسی غزل میں ناقص مقطع نہیں ہے جب کہ ناقص مقطعوں کی زیادہ تعداد ایسی ردیفوں میں ہے جو عام طور پر کم استعمال کی جاتی ہیں۔

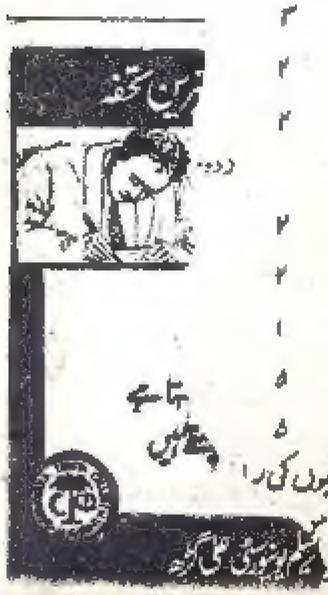
بنیادی طور پر ناقص مقطعوں کی کمی یا زیادتی، اس نقص سے پیدا ہونے والی صورت حال کو متاثر نہیں کرتی۔ اگر پورے دیوان میں ایک بھی مقطع ایسا درج ہوتا جس میں تخلص چھوڑ دیا گیا تھا، تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا کہ دوسرے مقطعوں میں تخلص کی موجودگی میں اس ایک غزل میں تخلص کیوں حذف کیا گیا۔

دیوان اسد میں ایک دو نہیں ۵۸ غزلوں میں تخلص کی جگہ خالی ہے، جب کہ اسی صفحے پر موجود دوسرے مقطعوں یا ماقبل یا مابعد غزلوں کے مقطعوں میں تخلص واضح طور پر درج کیا گیا ہے۔ اگر جلی قلم یا دوسری روشنائی سے تخلص لکھنا مطلوب ہوتا تو تخلص کو بیچ بیچ کی غزلوں میں سے نہیں چھوڑا جاتا بلکہ کسی ایک سلسلے سے، یا تو پورے دیوان میں، یا شروع کی یا آخر کی غزلوں میں تخلص نہ لکھا جاتا۔ اس قسم کی کسی کمی کو محض سہو پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سہو کی صورت میں سارے الفاظ کو متصل لکھا جاتا اور تخلص تحریر کرنے کے لئے جگہ نہ چھوڑی جاتی۔ لہٰذا یہ شک پیدا ہونا فطری ہے کہ تخلص عمداً چھوڑا گیا ہے۔

زیادہ مستعمل ردیفوں میں بلا تخلص غزلوں کا نہ ہونا اور کم مستعمل ردیفوں میں ایسی غزلوں کا تناسب زیادہ ہونا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ مرتب دیوان نے ان ناقص غزلوں کو دیوان میں اس غرض سے شامل کیا ہے کہ کم استعمال ہونے والی ردیفوں میں غزلیں بھی دیوان میں داخل ہو سکیں اور اس طرح مکمل مرتب دیوان کی ایک اہم شرط پوری ہو سکے۔ کم مستعمل ردیفوں میں ناقص غزلوں کی تفصیل درج ہے۔

ردیف	کل غزلیں	محذوف تخلص کی غزلیں
ب	۲	۲
ت	۲	۲
ث	۲	۲
ج	۳	۲
چ	۲	۱
ح	۱	۱
ڈ	۴	
ر	۷	
ز	۷	
س	۳	
ش	۲	
ع	۲	
غ	۲	
ف	۲	
ک	۱	
ل	۵	
م	۵	

اس طرح دس ردیفوں کی ... مقطعوں کے ساتھ درج ...



میں سے شاعر نے مصلحتاً تخلص حذف کیا ہے اور اس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ مقطعے میں اسدؔ کی جگہ کوئی دوسرا تخلص تھا اور کیونکہ دیوان کو ہر ردیف کی غزلوں کی شمولیت کے ساتھ مکمل کرنا تھا، اس لئے ان غزلوں کو دوسری غزلوں سے اپنی یادداشت کے لئے نمایاں رکھنے کی غرض سے بغیر تخلص کے تحریر کیا گیا اور بعد کے انتخابات میں بطور خاص ان غزلوں کو حذف کیا گیا۔ دو غزلیں تو دیوان اسدؔ کے باہر بھی کہیں نہیں ملتیں اور ۱۴ غزلیں مطبوعہ دیوان میں نہیں ہیں۔ باقی بارہ غزلوں میں سے مشکل سے ۲۲ شعر متداول دیوان میں پائے جاتے ہیں۔

ردیف "ع" کے بارے میں اوپر درج کیا گیا ہے کہ ایک غزل کا مقطع حاشیے پر مندرج ہے۔ پورے دیوان کی یہ خصوصیت ہے کہ ساری غزلیں مطلعے اور مقطعے کے شامل کی گئی ہیں صرف ردیف عین کا یہ مقطع سے

اے اسدؔ ہیں آشنا بیگانۂ سوز و گداز
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تاب استماع

لکھنے سے رہ گیا ہے اور بعد میں حاشیے پر بڑھایا گیا ہے۔ اس اضافے کا خط پورے دیوان کے خط سے مختلف ہے اور کشش میں پیرانہ سالی کے آثار نظر آتے ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ دیوان کے اضافوں میں یہ قدیم ترین اضافہ ہے اور دیوان کے اصل مصنف کے ذریعے کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میرا یہ بھی خیال ہے کہ نہ تو یہ مقطعے اور نہ متن دیوان کی تحریر غالبؔ کے معروف خط سے کوئی نمایاں مشابہت رکھتی ہے۔ باریکیوں میں جائے بغیر اس کا سب سے واضح ثبوت دائروں کی کشش ہے۔ غالبؔ کے خطوط کے عکس دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کے دائروں میں گہرا زیادہ اور بسط کم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ خاص ہی کیوں ہے "دری" کا کانی مبو تر سے بتاتے ہیں جس کی وجہ کرنا موجودہ رسم خط لمبی اور پتلا تنگ ہو جاتا ہے۔ س، ش، سوال کے جواب کی و دو صورت نظر آتی ہے۔ جب کہ اگر دیوان یعنی یہ کہ تبدیلی کا سیا جائے تو اس کے دائروں میں عمق کم اس اشارے کی ابای وجہ سے داہنی جانب سے بنائے سے اردو زبان آتا (جیسے س، ص، ن وغیرہ) میں اتصال کی وسعتوں میں آجاتا، ترکوں کے ساتھ افقی اتصال (جیسے ہو سکے گی۔ اس سبا نون اور لام میں کسی دوسرے حرف کے جمہوریہ ہند میں اصل میں عمودی کشش کو دائرے کی شکل میں رہ گیا ہے اور کیا، ہاتھ پر پیچھے ایک پہنی نکل آئی ہے اور بن سکتی؟ پھر یہ کہ یہ، بہ نسبت چوڑائی زیادہ پیدا ہوگی۔ غالبؔ جس کی روانیوں کو ہم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دیوان اسدؔ ہندی کا تعلق ہے وہ ہرگز اس، اش، اص وغیرہ کے دائرے نہ اسے تو بھی مرتبہ قبولیت حاصل عکس میں ان کا مقابلہ کر کے دیکھئے۔ یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ دائروں کی کشش عام طور پر ابتدائی مشق سے متعین ہو جاتی ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ اس میں صفائی اور پختگی تو آتی ہے لیکن بنیادی طور پر دائروں کی کشش کے رجحان پر کم ہی اثر پڑتا ہے۔

پورے قلمی دیوان میں اگر کوئی تحریر غالبؔ کی معروف تحریر سے مشابہت رکھتی ہے تو وہ یہ شعر ہے جو کہ الگ تحریر کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کھلتا کسو پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس شعر میں دائروں کی کشش اور حروف کی بیٹھک بڑی حد تک غالبؔ کے عام خط سے بہت قریب ہے اور باقی دیوان کے خط سے مختلف۔

ان مسائل پر اگر محققین معروضیت کے ساتھ غور کریں تو مجھے توقع ہے کہ بعض اہم نتائج مرتب ہوں گے۔

• ڈاکٹر سید حامد حسین

سندھی زبان کے رسم الخط کا مسئلہ

(ٹائمز آف انڈیا کے ایک مراسلہ کا ترجمہ)

۲۶ر جولائی کے ٹائمز آف انڈیا میں مس ستانی کا یہ بیان صحیح نہیں کہ سندھیوں کی نئی نسل عربی رسم الخط سے نا واقف ہے صرف عظیم بمبئی میں ایک درجن کے قریب ایسے اسکول ہیں جہاں عربی رسم الخط میں تعلیم دی جاتی ہے۔

سندھیوں میں دیوناگری رسم خط کو پھیلانے کی مہم نے بدقسمتی سے فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا ہے مرکزی اور ریاستی سرکاروں کو اس خطرے کا بروقت احساس کر لینا چاہیے۔

۱۹۶۱ء تک بمبئی کے میونسپل کارپوریشن نے سندھی طالب علموں کے لئے عربی کے رسم الخط کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اس کے خلاف ہائی کورٹ میں چارہ جوئی کی گئی۔ ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ عربی رسم الخط سندھی زبان کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس فیصلہ کے بعد ان سندھی بچوں کے والدین نے جو میونسپل اسکولوں میں تعلیم پا رہے تھے اپنے بچوں کو عربی رسم الخط کے ذریعہ تعلیم دینا پسند کیا یہ بات افسوسناک ہے کہ والدین کی طرف سے بار بار درخواست کرنے کے باوجود دہلی ایڈمنسٹریشن آج بھی سندھی بچوں کو عربی رسم الخط استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیا اسی کا نام ثقافتی آزادی ہے۔

گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ عربی رسم خط کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کرے سندھیوں میں اس رسم الخط کی مقبولیت کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ۹۰ سندھی رسالے اس ملک میں عربی رسم الخط میں شائع ہو رہے ہیں۔

بی۔ ایچ۔ ناگرانی۔ صدر اکھل بھارت سندھی بولی اور ساہتیہ سبھا بمبئی۔

اخبار و اذکار

آٹھویں درجہ تک اردو کو اختیاری مضمون بنانے کا مطالبہ

لکھنؤ۔ ریاستی بجٹ کے سلسلے میں آٹھویں دن کونسل میں مباحثہ کے دوران کانگریسی ممبر جناب چھیدی لال ساتھی نے اردو اکاڈمی کے قیام کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کو اس بات کا انتظام کردینا چاہیے کہ آٹھویں درجہ تک اسکولوں میں اردو کو اختیاری مضمون بنا دیا جائے۔

• الجمعیۃ دلی

اردو اپنا حق مانگتی ہے بھیک نہیں

ڈسٹرکٹ طالب علم یوتھ ویلفیر بورڈ کے جنرل سکریٹری نوجوان لیڈر جناب عظمت اللہ صدیقی نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی اور ان کے کابینہ نے اردو زبان کو جو کچھ دیا ہے وہ بھیک کے برابر ہے اردو بھیک نہیں مانگتی اپنا حق مانگتی ہے۔

اردو یوپی کے ایک بڑے طبقہ کی مادری زبان ہے اور اسے دوسری زبان تسلیم کرنا موجودہ حکومت کا فرض ہے۔

آپ نے کہا کہ گورنمنٹ اردو کے لئے معقول حق دے اور آٹھویں جماعت تک کے طالب علموں کے لئے لازمی مضمون قرار دینے کا فرمان جلد از جلد جاری کرے۔

• نامہ نگار

اردو اخباروں کے ایڈیٹروں کا احتجاجی مظاہرہ

نئی دہلی:۔ حیدرآباد (آندھرا) سے شائع ہونے والے بارہ اردو اخباروں کے ایڈیٹروں نے بنگلہ دیش میں ہونے والی نسل کشی کے خلاف یہاں پاکستانی ہائی کمیشن کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا۔

ان کو عمارت سے کچھ دور روک دیا گیا تھا چونکہ ان کی یادداشت لینے کے لئے ہائی کمیشن سے کوئی نہیں نکلا اس لئے انھوں نے اس کو عمارت کے آہنی جنگلے کے پار اندر کی سمت پھینک دیا۔

یادداشت میں ان بارہ اردو اخباروں کے ایڈیٹروں نے کہا ہے کہ بنگلہ دیش کے سلسلے میں ہم حکومت ہند کی پالیسی کو درست اور جائز خیال کرتے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ یہ جلد یا بدیر کامیاب ثابت ہوگی۔

دیوان غالب کے نایاب نسخہ کو پاکستان پہنچادینے کے سلسلے میں تحقیقات

نئی دہلی:۔ وزیر قانون وانصاف جناب ایچ آر گوکھلے نے لوک سبھا کو یقین دلایا ہے کہ اس الزام کے بارے میں تحقیقات ہوگی کہ دیوان غالب کا ایک نایاب مسودہ جو خود مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا چوری چھپے پاکستان پہنچادیا گیا ہے اور وہاں اس کی اشاعت ہوئی ہے

جناب شمیم احمد شمیم کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر قانون نے بتایا کہ صورت حال کس قدر پیچیدہ ہے کیوں کہ تحقیقات جزوی طور پر پاکستان میں ہونا ہے دراصل اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش ہو رہی ہے کہ آیا سی۔ بی۔ آئی تفتیش کا یہ کام سنبھال سکتی ہے۔ بہرحال کچھ تکنیکی دشواریاں ہیں ہندوستانی علاقے کے اندر تفتیش کرنے کے لئے عام پولیس مشنری حرکت میں آگئی ہے۔

جناب گوکھلے نے بتایا کہ اسمگل کرکے پاکستان پہنچائے جانے کی اطلاع غالب صد سالہ برسی کمیٹی نے حکومت کو دی تھی اس مسودے کا پتہ اپریل ۱۹۶۹ء میں بھوپال میں چلا تھا۔ اسی سال ستمبر میں اسے ہندوستان میں شائع کیا گیا۔ اسے عمدہ طباعت اور ڈزائن کا قومی ایوارڈ بھی ملا تھا۔

وزیر قانون نے تصدیق کی کہ یہ مسودہ بعد میں پاکستان میں شائع ہوا اور اس کے ایک نسخے کی قیمت وہاں تیس روپے تھی بعد میں اسے اسمگل کرکے ہندوستان لایا گیا اور یہاں فی نسخہ ۶۰ روپے کی قیمت پر فروخت کیا گیا۔

• قومی آواز

گورکھپور میں یوم ریاض خیرآبادی

مورخہ ۲۸ رجولائی کو ڈاکٹر سلام سندیلوی کی قیام گاہ پر

یوم ریاض خیرآبادی مرحوم منایا گیا جس کی صدارت حکیم ابوالکلام صدیقی نے فرمائی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ریاض بنیادی طور پر ایک عشقیہ شاعر ہیں، ان کو خمریہ شاعر کہنا اور "خیام الہند" کا خطاب دینا صداقت کے خلاف ہے کیونکہ ان کی خمریہ شاعری تخیلی، رسمی، قیاسی اور مصنوعی ہے۔ مجاہد علی نے "ریاض اور ان کی شاعری" پر ایک مضمون پڑھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ایک مقالہ بعنوان "اردو شاعری کا نرگس" "ریاض خیرآبادی ایک خودبیں شاعر" پڑھا۔

نثری دور کے بعد شعری دور شروع ہوا جس میں متعدد نامور شعرائے کرام نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ آخر میں صدر جلسہ نے ریاض کی شخصیت پر روشنی ڈالی اور ان کو ایک اہم شاعر قرار دیا۔

● مقبول حسین

"غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ" کی رسم اجرا

گورکھپور: یہاں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے ایک جلسے میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد استاد شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب "غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ" کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اسی موقع پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو نے کہا کہ "یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر ملک زادہ نے مولانا ابوالکلام آزاد پر تنقید و تحقیق کے کام میں مزید پیش رفت کی ہے۔ ان کی یہ نئی تصنیف نہ صرف ہماری دانش گاہوں کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے بلکہ اسے اعلیٰ تنقیدی روایات کے ایک اچھے نمونے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر احمر لاری نے کہا کہ "اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مولانا آزاد نے جس بلند علمی سطح سے غبار خاطر لکھی تھی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اسی سطح پر پہنچ کر اس کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔"

آخر میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔

● سید فضل امام رضوی

یوم ریاض خیرآبادی

گورکھپور: گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز یوم ریاض خیرآبادی سے ہوا۔

اس خصوصی جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبہ نے کہا کہ "اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ریاض کی شخصیت ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ گورکھپور میں گذرا ہے اور انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کا مرکز گورکھپور ہی کو بنایا اس لئے یہ بات یہاں کے دانشوروں کے فرائض میں شامل ہے کہ ان کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے رہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا کہ ریاض کی شخصیت کو شاعر خمریات تک محدود نہیں رکھنا چاہئے حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں اسی ذہنی اور سماجی کشمکش کی جھلک ملتی ہے جو بیسویں صدی کے پہلے ربع میں ہندوستانیوں میں پائی جاتی تھی۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے لکچرر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے ریاض کی نثری خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کی نثر نگاری کا بھی جائزہ لینا چاہئے کیونکہ ان کی نثر صحافتی سطحیت سے مبرا ہے اور معیاری نثر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

ڈاکٹر احمر لاری نے اس موقع پر کہا کہ ریاض کے بہت سے خطوط ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں ہمیں چاہئے کہ انھیں فراہم کریں اور ان کی اشاعت کا اہتمام کریں، انھوں نے اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ شعبۂ اردو میں ریاض پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

● مجاہد حسین رضوی

شاغل قادری (مرحوم) کو خراج عقیدت

ایوان ارشاد بھاگلپور میں قدیم بزم سخن اور حلقۂ ادب بھاگلپور کے زیر اہتمام جناب شاغل قادری کے اچانک سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں متعدد دانشوروں نے مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا۔

آخر میں دعائے مغفرت کے بعد تعزیتی تجویز اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

● صمد حمیدی

صفحہ ۶ سے آگے

ترقی کر رہی ہے اور اس وقت دنیا کی سب سے رائج زبان ہے۔ اس واقعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ترقی کرنے کے لئے ایک تشکیل شدہ زبان کے رسم خط کو خواہ وہ کتنا ہی ناقص ہو بدلنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ اس زبان کے بولنے اور اس سے محبت رکھنے والے اس کی اندرونی قوت و صلاحیت پر اعتماد کریں، اس کے اوصاف کی قدر کریں اور اپنے حوصلے اور عزائم بلند رکھیں اور اس عزم و حوصلہ کے مطابق فراست و بصیرت کے ساتھ محنت پیہم کرتے چلے جائیں، تاکہ ان کا حقیقی داخلی جوہر زمانے میں زیادہ سے زیادہ آشکار ہو۔

▲

اردو گھر فنڈ

چندہ "اردو گھر" فنڈ یکم اپریل ۱۹۷۱ء تا ۳۱ جولائی ۱۹۷۱ء)

نمبر شمار	نام و مقام معطی	رقم چندہ	ذریعہ ترسیل	کیفیت
۱۔	دشو جیت گپتا ایم۔اے ایل۔ایل۔بی	۱—۰۰		معرفت پروفیسر گیان چند جین، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، شاخ کشمیر
۲۔	اوم کار ناتھ کنول	۱—۰۰		
۳۔	گیان چند آتش	۱—۰۰		
۴۔	وید پرکاش گپتا	۱—۰۰		
۵۔	مالک رام آنند	۱—۰۰		
۶۔	پشکر ایم اے	۱—۰۰		
۷۔	شیام لال سوترا	۱—۰۰		
۸۔	دریام داس ایم۔اے بی۔ایڈ	۱—۰۰		
۹	رمیش چندر گپتا بی۔ایس سی	۱—۰۰		
۱۰۔	خرسال چند گپتا ادیب فاضل	۱—۰۰		
۱۱۔	ایس۔پی۔ڈھیر بی۔اے بی۔ایڈ	۱—۰۰		
۱۲۔	پریم ناتھ ایم۔اے ہندی۔ایم۔اے سنسکرت	۱—۰۰		
۱۳۔	نور الزماں صدیقی	۱—۰۰		
۱۴۔	لکشمی چند	۱—۰۰		
۱۵	محمد لطیف شاہ	۱—۰۰		
۱۶۔	محمد اشرف حسینی	۱—۰۰		
۱۷۔	جگن ناتھ کول	۱—۰۰		
۱۸۔	محمد مختار لون	۱—۰۰		
۱۹۔	غلام حسن بٹ	۱—۰۰		
۲۰۔	سنتندر سنگھ	۱—۰۰		
۲۱۔	حکیم منظور	۱—۰۰		
۲۲۔	محترمہ بیگم حکیم منظور	۱—۰۰		
۲۳۔	جناب آفاق منظور	۱—۰۰		
۲۴۔	" عبد الرشید قادری	۱—۰۰		
۲۵۔	" رام لال گپتا	۱—۰۰		
۲۶۔	محترمہ بیگم عبد الرشید قادری	۱—۰۰		
۲۷۔	محمد یٰسین قادری	۱—۰۰		
۲۸۔	بشارت قادری	۱—۰۰		
۲۹۔	محمد مسرت قادری	۱—۰۰		
۳۰۔	جناب سبحان علی	۱—۰۰		معرفت پروفیسر گیان چند جین، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، شاخ کشمیر
۳۱۔	" عبد الحق	۱—۰۰		
۳۲۔	" شمس الحق	۱—۰۰		
۳۳۔	" شبیر علی	۱—۰۰		
۳۴۔	" منظر اعظمی	۱—۰۰		
۳۵۔	" کستوری لال گپتا	۱—۰۰		
۳۶۔	" عبد العزیز	۱—۰۰		
۳۷۔	" ظہور الدین	۱—۰۰		
۳۸۔	" آل علی	۱—۰۰		
۳۹۔	" ضیا آفریدی (رسید ۳۱)	۱—۰۰		
۴۰۔	" " " " رسید ۳۲	——۱		
۴۱۔	" " " (رسید ۳۳ تا ۳۵)	۳—۰۰		
۴۲۔	" چرن جیت سہائے	۱—۰۰		
۴۳۔	" پنچھی	۱—۰۰		
۴۴۔	" سردار ہربنس سنگھ	۱—۰۰		
۴۵۔	" مرزا	۱—۰۰		
۴۶۔	" چندر کھا (رسید ۳۸ تا ۴۱)	۴—۰۰		
۴۷۔	" چنچل شرما (رسید ۴۲ تا ۴۶)	۵—۰۰		
۴۸۔	" کسپائی	۱—۰۰		
۴۹۔	" لال سنگھ	۱—۰۰		
۵۰۔	" ظ	۱—۰۰		
۵۱۔	" ظہور الدین	۱—۰۰		
۵۲۔	" آزاد	۱—۰۰		
۵۳۔	" جتیندر شرما	۱—۰۰		
۵۴۔	" جوگندر سکار	۱—۰۰		
۵۵۔	" وجے کمار	۱—۰۰		
۵۶۔	" ڈاکٹر رام پرتاپ	۱—۰۰		
۵۷۔	محترمہ پروفیسر کوشل بالی	۱—۰۰		
۵۸۔	" ڈاکٹر وید گھئی صدر شعبۂ سنسکرت	۱—۰۰		
۵۹۔	جناب پروفیسر لکشمی نرائن شعبۂ انگریزی	۱—۰۰		
۶۰۔	جناب ڈاکٹر اوپر سوناتھ صدر شعبۂ انگریزی	۱—۰۰		
۶۱۔	جناب پریم سنگھ جی	۱—۰۰		
۶۲۔	" بودھ راج چندا	۱—۰۰		
۶۳۔	" ڈاکٹر گیان چند جین (رسید ۳۱ تا ۶۳)	۲۹—۰۰		

معرفت ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب، لکھنؤ

۶۴۔ محترمہ ثریا ضیاء ۱—۰۰
۶۵۔ " جلیس فاطمہ علوی ۱—۰۰
۶۶۔ " اخلاق فاطمہ ۱—۰۰
۶۷۔ " محبوب فاطمہ ۱—۰۰
۶۸۔ جناب حبیب خاں ۱—۰۰
۶۹۔ " فاروق احمد ۱—۰۰
۷۰۔ " جاوید احسن ۱—۰۰
۷۱۔ " سید سعید الدین ۱—۰۰
۷۲۔ محترمہ جمال آرا سلیمان ۱—۰۰
۷۳۔ جناب چودھری محمد نعیم ۱—۰۰
۷۴۔ " امتیاز علی خاں ۱—۰۰
۷۵۔ " عاصم قدوائی ۱—۰۰
۷۶۔ " محمد قاسم ۱—۰۰
۷۷۔ " سید حسین ۱—۰۰
۷۸۔ " محمد علیم صدیقی ۱—۰۰
۷۹۔ محترمہ نزہت جمال ۱—۰۰
۸۰۔ " تاجور سلطانہ ۱—۰۰
۸۱۔ " خورشید ۱—۰۰
۸۲۔ " سارہ دررانی ۱—۰۰
۸۳۔ جناب آل رضا ۱—۰۰
۸۴۔ " محمد یوسف ۱—۰۰
۸۵۔ " محمد انصار علی ۱—۰۰
۸۶۔ " شبیر احمد ۱—۰۰
۸۷۔ " محمد توقیر ۱—۰۰
۸۸۔ " جان محمد ۱—۰۰
۸۹۔ " التفات احمد ۱—۰۰
۹۰۔ " قمر الدین ۱—۰۰
۹۱۔ " عبدالکریم ۱—۰۰
۹۲۔ " عبدالقدیر ۱—۰۰
۹۳۔ " اشہد محمود ۱—۰۰
۹۴۔ " حبیب احمد ۱—۰۰
۹۵۔ " لئیق احمد ۱—۰۰
۹۶۔ " ملک محمد حسین ۱—۰۰
۹۷۔ " محمد صدیق ۱—۰۰
۹۸۔ " اویس حسن ۱—۰۰

معرفت ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب، لکھنؤ

۹۹۔ جناب رفیق احمد ۱—۰۰
۱۰۰۔ " راشد عمر ۱—۰۰
۱۰۱۔ " سعید الحسن ۱—۰۰
۱۰۲۔ " طفیل احمد ۱—۰۰
۱۰۳۔ " شاہد عامر ۱—۰۰
۱۰۴۔ " شہاب صدیقی ۱—۰۰
۱۰۵۔ " شہباز وحید ۱—۰۰
۱۰۶۔ " زبیر حسین ۱—۰۰
۱۰۷۔ " ظہیر الدین ۱—۰۰
۱۰۸۔ " عبدالرشید ۱—۰۰
۱۰۹۔ " اعجاز احمد ۱—۰۰
۱۱۰۔ " غلام رسول ۱—۰۰
۱۱۱۔ " عبدالمجیب ۱—۰۰
۱۱۲۔ " فضل باری ۱—۰۰
۱۱۳۔ " محمد اظہر ۱—۰۰
۱۱۴۔ " ندیم الحسنین ۱—۰۰
۱۱۵۔ " محمد یونس ۱—۰۰
۱۱۶۔ " کبیر الدین احمد ۱—۰۰
۱۱۷۔ " محمد رضا ۱—۰۰
۱۱۸۔ " شبیر احمد ۱—۰۰
۱۱۹۔ " عتیق الرحمن ۱—۰۰
۱۲۰۔ " جاوید اختر ۱—۰۰
۱۲۱۔ " نعیم احمد ۱—۰۰
۱۲۲۔ " محی الدین اشرف ۱—۰۰
۱۲۳۔ محترمہ رضیہ سلطانہ ۱—۰۰
۱۲۴۔ جناب سید علی ظفر ۱—۰۰
۱۲۵۔ " عبید الشدا اعظمی ۱—۰۰
۱۲۶۔ " محمد متین ۱—۰۰
۱۲۷۔ " ظفر الاسلام ۱—۰۰
۱۲۸۔ " محمد ہارون ۱—۰۰
۱۲۹۔ " انیس احمد ۱—۰۰
۱۳۰۔ نام نہیں ظاہر کیا (ایک اردو دوست) ۱—۰۰
۱۳۱۔ جناب عارف ولی ۱—۰۰
۱۳۲۔ " احمد ضیاء خاں ۱—۰۰

(باقی آئندہ)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپا یا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L-922 فون نمبر ۲۹ R.NO. 2186/57